تہذیبی واخلاقی اقدار کا بحران اور اردو ناول

ڈاکٹر واثق الخیر

E mail: wasujnu@gmail.com

تہذیب کسی بھی سماج اور کسی بھی قوم کے عقیدے اور نظریات، رسم و رواج، آداب و اطوار، رہن سہن، طرز زندگی، بود و باش، رفتار و گفتار، اخلاق، معاملات، علمی، ادبی، فنی اور سائنسی کارناموں، طرز حیات اور انداز تمدن اور علمی و فنی سرمائے کا نام ہے۔ جو کسی بھی انسان کی شناخت اور اس کی بقا کی ضمانت ہے۔ انسان نے اپنے انفرادی بود و باش سے اجتماعی و سماجی رہن سہن تک کے سفر میں کائنات کی وسعتوں میں ذہنی، سماجی، اخلاقی، مادی اور روحانی کیفیات و اکتسابات کے مختلف منزلوں سے گزرتے ہوئے جن چیزوں کو حاصل کیا ہے اسی کا نام تہذیب ہے۔ تہذیب صرف کسی خاص طرح کی شائستگی اور ادب و آداب سے متعلق نہیں ہے بلکہ اس کے مختلف زاویے ہیں، مختلف دائرے اور حلقے ہیں۔ رجحانات اور میلانات ہیں۔ رسم و رواج، نظام معاشرت، رہن سہن، ملبوسات، زیورات، اقتصادی تنظیم، معاشرتی ادارے، سیاست و تمدن، اقتصادی و معاشی امور کی لین دین، تجارت، زراعت، صنعت و حرفت، تعمیرات، شہری انتظام، صحرانشینی اور مذہبی معاملات وغیرہ انسانوں کی زندگی میں داخل رہے ہیں اور ان سب کا زاویہ اور نظریہ انسانی تہذیب و اخلاق کا حصہ ہیں۔

تہذیب کا خاکہ بڑی حد تک انسان کا اپنا ساختہ پرداختہ ہے۔ ظاہر ہے اس کا تعلق معاشرے سے ہے، چنانچہ تہذیب خلا میں جنم نہیں لیتی۔ یہ تو حقیقت ہے کہ تہذیب کے بعض

رویے کسی قوم کو وراثت میں ملتے ہیں تاہم ان رویوں کا نام بھی تہذیب ہے جو وہ اپنے خاص ماحول میں خاص عقائد وافکار اور دوسرے اثرات کے تحت پیدا کرتا ہے۔ یہ اکتسابی عمل بھی کسی قوم کی تہذیب میں یگانگت اور دوسری اقوام سے امتیاز واختلاف پیدا کرتا ہے۔اس لحاظ سے تہذیب فرد اور اجماع دونوں کا مشترکہ سرمایہ ہے۔

تہذیب وسیع ترین ثقافتی اکائی کا نام ہے۔ یہ نام ہے اقدار کے ہم آہنگ وشعور کا، جو ایک انسانی جماعت رکھتی ہے۔ جسے افراد اپنے جذبات، رجحانات، اپنے برتاؤ اور اثرات میں ظاہر کرتے ہیں۔ ہر معاشرہ بالعموم ان قدروں کو اپنی جان، مال اور جائیداد سے بھی زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ان تہذیبی قدروں کے لیے کسی قوم میں بڑی جذباتیت ہوتی ہے۔ ہر قوم مختلف اشیاء، عقائد، خیالات اور دیگر تہذیبی قدروں کو اپنے اقدار کی کسوٹی پر پرکھتا ہے جو قدریں، جو چیزیں اس کسوٹی پر پورا اتریں وہ قبول کرلی جاتی ہیں۔ان قدروں کی بنیاد معاشرے میں، زمین ہی میں موجود ہوتی ہیں۔ نہ یہ جبراً نافذ کی جاتی ہے نہ آسمان سے اترتی ہیں۔ بلکہ ان کے پس پست صدیوں کے تاریخی رواج کارفرما ہوتے ہیں۔ معاشرے کے کسب و جہد، مشاہدات اور تجربات ہوتے ہیں۔اس کا فکری آہنگ اور جمالیاتی ذہن ہوتا ہے اور عموماً معاشرے کے افراد ان کی پابندی کرتے ہیں۔

ہندوستان روز اول سے ہی مختلف قوموں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ گذشتہ کئی صدیوں سے یہاں دنیا کے مختلف خطے سے قومیں تجارت اور سیر وسیاحت کی غرض سے آتی رہی ہیں جو بعد میں یہیں کے ہوکر رہ گئیں۔ یہ قومیں اپنے ساتھ اپنی زبان، رنگ وروپ، آداب واطوار، طرز معاشرت، اخلاق وعادات کے علاوہ عقائد ونظریات بھی لائیں۔ غیر ممالک سے آئے ہوئے تہذیبی سرمائے اور یہاں کی تہذیبی ذخیرہ میں اتصال اور میل جول کا عمل صدیوں تک قائم رہا اور آج بھی جاری ہے۔اسی اتصال اور میل جول سے جو تہذیب نکل کر آئی اسے ہندوستانی تہذیب کا نام دیا گیا۔

ہندوستان کے عہد قدیم سے لے کر تقسیم ملک تک یہاں کی تہذیبی وثقافتی فضا کئی

مراحل سے گزر کر مختلف دھاروں کے امتزاج سے ایک وحدت میں ڈھلتی چلی گئی۔ بھگتی تحریک اور تصوف کی بنیاد انسان دوستی اور محبت کی تلقین پر مبنی تھی۔ اس تحریک نے سارے ملک کو ایک وحدت میں پیش کیا۔ صوفیوں اور بھگتوں کی نظر میں سارے مذاہب یکساں تھے۔ اس تحریک نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں متحد کرایا تھا۔ ہندو مسلمان آپس میں خلوص و محبت کے ساتھ رہتے تھے۔ اسی اتصال اور میل جول کے عمل سے مشترکہ ہندوستانی تہذیب نے جنم لیا جو بلا شرط مذہب و ملت سب کے لیے قابل قبول ہوئی اور ہندوستان کی پہچان بن گئی۔

اردو کے ناول نگاروں نے ہندوستان کی زوال پذیر تہذیب و ثقافت کو اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے۔ اور اس کا بیان کر کے اپنے درد کا اظہار کیا ہے اور آئندہ کے نسلوں کو ایک سبق بھی دیا ہے کہ تہذیبی و ثقافتی قدروں کی حفاظت کتنی ضروری ہیں۔ اس طرف متنبہ بھی کیا ہے کہ ان قدروں کے زوال سے سماج کو کن مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

احسن فاروقی کا ناول 'شام اودھ' لکھنؤ کی جاگیردارانہ زوال پذیر معاشرت اور تہذیب کی عکاسی کرتا ہے۔ ناول میں جس سماج و معاشرے کو موضوع بنایا گیا ہے وہ تہذیبی اعتبار سے انتہائی شکست خوردہ ہے۔ نواب ذوالفقار علی خان کو مرکزی کردار بنا کر نوابی دور کی انحطاط پذیر تہذیب کو سامنے لایا گیا ہے۔ ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ لکھنؤ کی تہذیب کا سب سے اہم مرکز ایک نواب کا محل ہوسکتا ہے۔ کیوں کہ اعلی اور نواب طبقے کے لوگوں کے پاس ایک وضع قطع ہوتا تھا۔ اس میں زندگی گزارنے کے کچھ اصول و ضوابط ہوتے تھے۔ اس لیے جب تک ان کے اندر اعلی انسانی اقدار باقی تھیں تو وہ زندہ رہیں لیکن جب ان میں طرح طرح کی برائیاں اور بداخلاقیاں پیدا ہوئیں تو وہ زوال کا شکار ہو کر رہ گئیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ناول پر اظہار کیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''شام اودھ میں حقیقی سطح پر تو اودھ کی تہذیب کی تخریب و بربادی کا نقشہ سامنے آتا ہے لیکن ذہنی سطح پر اس میں زوال کی وہی تصویر ابھرتی ہے جو

آفاقی ہے۔'شام اودھ' میں تہذیب کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ بے جان اور بے حس و حرکت نہیں بلکہ اس میں کشمکش اپنی نمایاں ہے کہ رُجعت پرست کھوکھلے نظام کے اندر ہی سے ترقی کی قوتیں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ نواب صاحب رُجعت کے نمائندہ ہیں لیکن اپنے ایک غیر کفو بھتیجے کو، اس کے باپ کی وصیت کی بنا پر وہ انگریزی تعلیم دلا رہے ہیں اور اس سارے عمل سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ معاشرہ و تہذیب اندر ہی اندر بدل رہے ہیں اور پرانی اقدار کے غیر انسانی عناصر فنا ہو کر نئی صورت کو جنم دے رہے ہیں۔''(13)

قرۃ العین حیدر کا ناول 'میرے بھی صنم خانے' اودھ کے زوال پذیر جاگیردارانہ معاشرے کی مٹتی ہوئی تہذیبی قدروں کی نشاندہی کرتا ہے۔ ناول میں رخشندہ کا پورا خاندان ہوتا ہے۔ جس پر تقسیم کے اثرات پڑتے ہیں۔ ناول میں اودھ کی مشترکہ تہذیبی وراثت کا ذکر بڑے غمناک انداز میں کیا گیا ہے کہ کیسے وقت کی ایک ٹھوکر میں صدیوں کی وراثت منتشر ہو جاتی ہے۔ اقتباس دیکھیں:

''تہذیب کے مرکزوں اور گہواروں میں پلنے والے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے صحراؤں کی طرف نکل گئے۔ امام باڑے ویران اور مسجدیں شکستہ ہو گئیں۔ پرانے خاندان مٹ گئے۔ زندگی کی پرانی قدریں خون اور نفرت کی آندھیوں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ ایک عالم تہہ و بالا ہو گیا۔ وہ تہذیب ہندوؤں اور مسلمانوں کا وہ معاشرتی اور تمدنی اتحاد وہ روایات وہ زمانہ سب کچھ ختم ہو گیا۔''(14)

عصمت چغتائی کا ناول 'معصومہ' آزادی کے بعد حیدرآباد کے مسلم گھرانے کی تہذیبی و اخلاقی قدروں کو بیان کرتا ہے۔ آزادی کے بعد رئیسانہ زندگی گزارے ہوئے مسلم سماج کی حالت

زار کو دکھایا ہے کہ کیسے ایک شریف لڑکی کال گرل بن جاتی ہے۔اس کے پیچھے دراصل سماج کا وہ چہرہ سامنے آتا ہے جس کی وجہ سے معصومہ اس دلدل میں پھنس جاتی ہے۔آزادی کے بعد بہت سے ایسے گھرانے ہوتے ہیں جو تہذیبی واخلاقی طور پر بحرانی صورت حال سے گزرتے ہیں۔

اسی طرح ''ٹیڑھی لکیر'' میں تہذیبی واخلاقی قدروں کی بحرانی صورت حال پر روشنی پڑتی ہے۔ناول کا کردار شمن کو اسکول کی زندگی میں ایک لڑکی سے جنسی لگاؤ پیدا ہوجاتا ہے۔گھر کا ماحول مشرقی تھا۔کالج اور اسکول میں اسے نئی زندگی ملتی ہے، حالات کی تبدیلیوں کے ساتھ اسے بھی بدلنا پڑا اور نئے ماحول میں وہ اپنی ان جنسی خواہشات کا حل چاہتی تھی جو اس کے لاشعور میں بچپن سے موجود تھیں لیکن گھر کا ماحول جگہ جگہ رکاوٹ بنتا ہے جس سے اس کے مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہوجاتا ہے۔دراصل ان کے اندر جو تبدیلی آرہی تھی وہ قدیم اور جدید تہذیب کے درمیان جو کشمکش چل رہی تھی اس کی وجہ سے ہوئی تھی۔مسلم متوسط گھرانوں میں پردے کا رواج رفتہ رفتہ ختم ہوتا جارہا تھا۔گویا مسلم سماج کی جو قدیم تہذیبی واخلاقی قدریں تھیں وہ بحرانی دور سے گزر رہی تھیں۔

عزیز احمد کا ناول ''ایسی بلندی ایسی پستی'' میں آزادی کے بعد بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں مختلف گھرانوں کی تہذیبی زندگی کو پیش کیا گیا ہے۔ایک طرف ملک میں آزادی کی لڑائی لڑی جارہی ہے اور دوسری طرف شمالی ہند سے دور حیدرآباد کے اعلی طبقے عیاشیوں میں زندگی بسر کررہے ہوتے ہیں۔حیدرآباد کے نوابوں کا دوسری شادی کرنا اور گھر میں دلجوئی کے لیے کنیزوں کا رکھنا عام سی بات ہوگئی تھی۔اسی طرح عورتوں کا مردوں کی محفل میں شراب پینا، رقص کرنا، تاش کھیلنا، اور مغربی طرز کا لباس پہننا اعلی طبقے کا معمول بن گیا تھا۔عزیز احمد نے ناول میں نور جہاں اور سلطان حسین کے کردار میں ازدواجی زندگی کی پیچیدگیوں کو بڑی باریکی سے پیش کرکے اعلی طبقے کی ذہنی پستی پر روشنی ڈالی ہے۔سلطان حسین کا اپنی بیوی نور جہاں سے خراب سلوک کرنا اور اجنبی و حسین لڑکیوں سے فلرٹ کرنا، کلب میں جانا اور شراب پینا وغیرہ تہذیبی واخلاقی قدروں کی بحرانی صورت حال کو بیان کرتا ہے۔

عہد جدید کی انسانی زندگی میں تہذیبی و اخلاقی بحران اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے کیوں کہ ہر شئے بناوٹی اور تجارتی ہوگئی ہے۔صورت حال یہ ہے کہ دوستی، محبت، اخلاق و مذہب، عزت و عصمت، علم وحکمت سب تجارتی شئے بن گئے ہیں۔آج مادہ پرستی عام ہے اور ہر شعبے پر چھا گئی ہے۔معلوم یہ ہوا کہ جدید تہذیب کلیتًا مادی ہے۔ جسے انسان نے اس لیے نہیں اپنایا ہے کہ وہ اس کے مزاج اور فطرت سے ہم آہنگ ہے بلکہ انسان کو مشینی اور سائنسی ایجادات اور مادی ترقی کے سیلاب نے یہ موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اس بارے میں سوچتا اور اس کے مثبت ومنفی پہلوؤں پر غور وفکر کرتا۔ چنانچہ انسان اس سیلاب میں خس وخاشاک کی طرح بہتا چلا گیا۔ دور حاضر میں ہوسنا کی، مال وزر کی رغبت، جنسی خواہشات میں بڑے چھوٹے سبھی مبتلا ہیں۔ جدید علم نفسیات نے جنسی اور دیگر مذموم خواہشات کو بڑھاوا دے رکھا ہے۔جس کے باعث نفوس آزاد ہیں۔صبر وتحمل، سکون و راحت راندۂ درگاہ ہو چکے ہیں۔تعلیم اگر چہ عام ہے لیکن وہ طلبہ پیدا نہیں ہو رہے ہیں جو اخلاق و کردار کا بلند نمونہ ثابت ہوں۔ کتب خانوں، کتابوں، رسالوں اور اخبارات کی کھلی نمائش ہے لیکن لوگوں کا گھٹیا قسم کی کتب جو غیر ادبی اور غیر معیاری یعنی شہوانی جذبات کو بھڑکانے والے ناول اور افسانے وغیرہ پڑھنے کی طرف رجحان زیادہ ہے۔جس سے اخلاق و مذہب اور روحانیت سے عاری ہو رہے ہیں۔ بہر حال جدید تہذیب غیر محسوس طریقے سے انسانوں کی زندگی پر حاوی ہو رہی ہے۔لوگوں نے نیکی و بدی کا امتیاز کھو دیا ہے۔ان تمام بداخلاقیوں اور گمراہیوں کو اپنا لیا ہے۔جن سے دور رہنے یا بچنے کے لیے مذہب وقانون انسان کی رہنمائی کرتے ہیں۔لیکن اب انسان نے مادی آسائشوں کے حصول کی خاطر مذہب وقانون اور تمام سماجی، تہذیبی و اخلاقی ضابطوں کو پس پشت ڈال دیا ہے اور ایک ہی رنگ میں رنگے جا رہے ہیں۔ جو ہندوستان کی تہذیبی و اخلاقی اقدار کے لیے بڑے چیلنجز ہیں۔ یہ وہ چیلنج ہے جس میں ہندوستانی تہذیب اور مغربی تہذیب آپس میں متصادم ہیں اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے فراق میں ہیں جس میں کبھی مقامی تہذیب غالب آتی ہے تو کبھی مغربی تہذیب۔لیکن مغربی یعنی جدید تہذیب کے یلغار سے قدیم تہذیب کب تک بچ

سکتی ہے۔ جدید تہذیب اپنے نئے لالی پوپ سے پرانی تہذیب کو متاثر کرتی رہتی ہے اور اسے زیر کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

جدید دور کے اردو ناول نگاروں نے مذکورہ بالا باتوں کو بڑی فکرمندی سے لیا اور اپنے ناولوں کے ذریعے بدلتے تہذیبی منظرنامے اور ان کے چیلنجز کو بہت ہی اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں زندگی کی ماہرانہ ڈھنگ سے پیش کش موجود ہے۔ جس میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات سے آگہی کو بڑے سلیقے سے بڑتا گیا ہے۔ سماجی و تہذیبی کمزوریوں اور خوبیوں، اچھائیوں اور برائیوں کا بیان منصفانہ طریقے پر ملتا ہے۔ فکشن نگار غضنفر دور جدید کے ادب پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بدلتے ہوئے تہذیبی، سماجی، سیاسی، ثقافتی، اقتصادی اور مذہبی منظرنامے کی اتھل پتھل، ناپائیداری، سراسیمگی اور اس میں نہاں انسان کی بنیادی کمینگی، خودغرضی اور ریاست اور بین الاقوامی سیاست کی مکاریوں کے قائم کردہ فلاحی ڈھونگ اور نئی اجارہ داریاں قائم کیے جانے کے سازش کے تحت ان سازشوں کو کمک پہنچانے والی نئی زمان میں پوشیدہ بغض وعناد آج کے ادیب کے لیے ادب تخلیق کرنے کے کاروبار کے واسطے اہم محرکات بن رہے ہیں''۔ (23)

دور جدید کے ناول نگار اپنے ناولوں میں وہی کچھ پیش کر رہے ہیں جو ان کے تجربات و مشاہدات کا حصہ ہیں۔ زندگی کا کینوس اتنا وسیع اور رنگا رنگ ہے کہ اس کی نیرنگیاں اور حیرتناکیاں ہمارے لیے محرکات کا خزانہ سمیٹے ہوئے اس رسم کے انتظار میں چشم براہ رہتی ہیں جو اس عالمی سکھ دکھ میں شریک ہونے کا موقع دیتی ہیں۔ زندگی اور زمانہ ہمارے لیے نئے نئے تجربات، مطالبات اور واقعات کا مجموعہ ہماری حیرت، ٹکراؤ، خوف، تسکین اور تسلی، امید و بیم، یقین و گمان، انتظار اور اعتماد کی قوتوں کو بیدار رکھتا ہے اور زندگی کی معنویت، حیات و کائنات کے ربط اور رشتوں کے

بارے میں سوال جواب کے سلسلے کو قائم کرتا ہے۔خورشید عالم لکھتے ہیں کہ:

''گذشتہ دس پندرہ سال میں ہماری زندگی میں سماجی، سیاسی، معاشی اور فکری سطحوں پر نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ہمارے جینے کا ڈھنگ بدلا ہے، سوچنے کا انداز بدلا ہے، قدروں کے پیمانے بدلے ہیں اور مسائل کی شکلیں بدلی ہیں۔ بنیاد پرستی، ذات پات، آدرشوں کا فقدان، دہشت گردی کا زور، ملٹی نیشنل کمپنیوں کی آمد، صارفیت کا غلبہ اور کالے دھنوں کے فروغ سے آج کی زندگی اثر پذیر ہوئی ہے۔ مزید یہ کہ الیکٹرانک میڈیا کی ترقی کے بعد آج کا فن کار قصباتی، شہری اور ملکی حدود سے نکل کر ساری دنیا سے جڑ گیا ہے یعنی اس کے تجربات اور مشاہدے کے لیے ایک بڑا کینوس تیار ہو گیا ہے''۔(24)

موجودہ دور میں ہندوستان میں تہذیبی و اخلاقی اقدار کو درپیش چیلنجز ہیں۔ان چیلنجز کا عکس آٹھویں دہائی کے ناولوں میں بخوبی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اقبال مجید کا ناول ''نمک'' لکھنؤ کی تہذیبی و اخلاقی اقدار سے شروع ہو کر بیسویں صدی کے آخری عشرے کی مادی تہذیب پر ختم ہوتا ہے۔ جو اس سوال کو اٹھاتا ہے کہ اکیسویں صدی کی نئی بنتی ہوئی تہذیب میں ادب اور پرانی تہذیب کی کوئی حقیقت باقی رہے گی بھی یا نہیں یا پھر انسان صرف کمپیوٹر میں فیڈ، لیپ ٹاپ کی فصیلوں پر منحصر اور کلون میں اسیر ہو کر رہ جائے گا۔اسی طرح موجودہ تہذیب کے حساب سے کیا علم، کلچر اور اخلاقیات سے پرے رہے گا۔ایک ہی گھرانے کی تین نسلوں کے ذریعہ تہذیبی و اخلاقی اقدار میں جو بڑی تبدیلی آتی ہے اس کو دکھایا ہے۔تہذیبی و اخلاقی اقدار کے طور پر سب سے زیادہ چیلنجز تیسری اور نئی نسل کے سامنے آتے ہیں۔ یہ تیسری نسل پوتے پوتیوں، نواسوں نواسیوں اور ان کے نوجوان دوستوں کی ہے جو سائنسی ترقی کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، انٹرنیٹ، موبائل وغیرہ میں الجھتے جاتے ہیں۔ یہ نسلیں ساری ترقیوں اور کامیابیوں کو مٹھی میں بند کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ کامیاب بھی

نہیں ہوتے ہیں۔ وہ منزلوں کی تلاش میں بھاگ رہے ہیں اس کے لیے وہ کبھی جنسی آسودگی کا سہارا لیتے ہیں اور کبھی نشیلی اشیاء کا استعمال کر کے بے راہ روی کے شکار ہوتے ہیں۔ سائنسی ترقی کے بے بنیاد فلسفوں اور منتشر خیالات اور طرز فکر کا اظہار کر کے ماضی سے ان کا کوئی سروکار نہیں رہتا۔ حال سے یہ مطمئن نہیں ہوتے اور مستقبل کا کوئی پتہ نہیں ہوتا ہے۔ ان نسلوں کے سامنے عالم کاری، ماس میڈیا اور جدید تکنالوجی ایک چیلنج کے طور پر سامنے آتی ہے۔ جس میں سارے لوگ تہذیبی و اخلاقی طور پر بہہ جاتے ہیں۔

آزادی کے کچھ دہائی بعد ہندوستان میں مغربی تہذیب کے اثرات سے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ اس کی وجہ سے مغرب پرست نوجوانوں میں اخلاقی پستی، روایتوں سے انحراف عام سی بات ہوگئی۔ مغرب پرست نوجوانوں اور ان کے مشرقی ماحول میں پرورش یافتہ والدین کے درمیان ذہنی ہم آہنگی نہیں رہی ہے۔ ایسے حالات میں نئی نسل اپنے والدین کو سمجھ نہیں پاتے ہیں اور نہ ہی والدین اپنی نئی نسل کو۔ ناول 'فرات' میں اس کی بہترین مثال ملتی ہے۔ ناول کا کردار تبریز مغرب پرست، جدید تعلیم یافتہ اور آزاد خیال کا پیداوار ہے تو دوسری طرف اس کے والد وقار احمد مذہبی اور اخلاقی ذہنیت رکھنے والے ہیں۔

حسین الحق نے اپنے ناول ''فرات'' میں ہندوستان کی قدیم تہذیب و اخلاق کے سامنے جو چیلنجز آرہے ہیں اور ان کی وجہ سے تہذیبی سطح پر جو تبدیلی آرہی ہے اس کا بے باکانہ اظہار کیا ہے۔ جہاں پہلے میاں بیوی کے درمیان ایک پردہ ہوتا تھا لیکن اب حالت یہ ہے کہ بیٹیوں کے سامنے یہ والدین اپنے کپڑے بدل رہے ہیں۔ دراصل یہ تبدیلی اس کلچر کی وجہ سے ہے جو سماج کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہے۔ حد تو یہ ہے کہ بیٹی اپنے بوائے فرینڈ کا ذکر کرتی ہے لیکن ماں اسے کچھ نہیں ٹوکتی ہے بلکہ باپ کے کہنے پر پرتپاک لہجے میں کہتی ہے کہ آپ کو کیا ہوگیا ہے جو بار بار ٹوکتے رہتے ہیں۔ دور حاضر کی نئی نسلوں میں یہ عام سی بات ہوگئی ہے کہ وہ بلا روک ٹوک غیر محرم سے مل سکتے ہیں۔ نوجوان لڑکا لڑکی آپس میں دوستی کر سکتے ہیں یہاں تک کہ آپس میں

اختلاط بھی قائم کر سکتے ہیں۔ مندرجہ ذیل کے اقتباس سے موجودہ دور کے اخلاقی اقدار کے حدود کا پتہ چلتا ہے کہ زمانہ قدیم میں کسی غیر محرم کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھنا جرم عظیم سمجھا جاتا تھا لیکن آج کے دور میں سیکس کے علاوہ ہر چیز اخلاقی حدود میں آتا ہے۔

علی امام نقوی کا ناول ''تین بتی کے راما'' میں بدلتی تہذیب کو ممبئی کی سماجی زندگی کے باطن کو گھریلو ملازمین کے ذریعہ پیش کرتا ہے کہ مہانگروں کے نوٹ زدہ معاشرے میں جائز و ناجائز طریقوں سے کمائی گئی دولت سیٹھ اور سرمایہ دار اپنی اکتاہٹ دور کرنے کے لیے کبھی شراب سے دل بہلاتے ہیں اور کبھی ملازموں سے مستفید ہوتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے کی بیویوں کا تبادلہ کر کے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ دوسری طرف بھاری زیورات اور قیمتی ساڑیوں میں ملبوس سیٹھانیاں بھی گھریلو ملازموں کو پالتی ہیں۔ ناول میں بیویاں بدلنے کے کھیل کو بیان کر کے شہر میں تہذیبی و اخلاقی زوال کی داستان سنائی جارہی ہے جو بڑے شہروں کے ایک کلاس میں فیشن اور شوق کے طور پر پروان چڑھ رہا ہے۔ اس ناول میں ممبئی کے تاجروں، سرمایہ داروں، ان کی بیویوں اور گھریلو ملازمین کے درمیان جسمانی تعلقات کو دکھایا ہے کہ ان کے درمیان تہذیبی قدریں ختم ہوگئیں ہیں۔ ان سب کے درمیان ایک خاموش معاہدہ ہے جس کے تحت دولت مند ان ملازموں اور ملازماؤں کو من مانے طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ اور بدلے میں انہیں چند روپیوں، اچھے کپڑوں اور مہنگے کھانوں و شرابوں کی رشوتیں دیتے رہتے ہیں۔ اس طرح فارم ہاؤس، پکنک مرکزوں اور پرائیوٹ فلیٹوں اور پرسنل بیڈروموں میں اس نئے معاہدہ، عمرانی تکمیل و توثیق ہوتی رہتی ہے اور اس اعلی طبقہ کی شرافت و اسٹیٹس کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچتی۔

عبدالصمد کا ناول ''دھمک'' تہذیب و تمدن، معاشرہ اور سیاست مل کر اپنے عہد کے آشوب کی شکل اختیار کرتا ہے۔ آج سیاست اتنی گندی ہوگئی ہے کہ اس کی وجہ سے جو بھی اس میدان میں جاتا ہے وہ اس کے جال کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایک لڑکے کے حوالے سے بات کی گئی ہے کہ وہ لڑکیوں کی آبروریزی پر سخت احتجاج کرتے ہوئے جب سیاست کے میدان میں پہنچ جاتا

ہے تو گندی سیاست ضمیر کی آواز کو دباتے ہوئے خود بے ضمیری کا شکار ہو جاتا ہے اور سیاست کے داؤں پیچ کو سیکھتے ہوئے سود و زیاں سے واقف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ایک سماج سیوک عورت کا ذکر ہے جو حاکموں کو عیاشی کا سامان فراہم کراتی ہے۔ اس گورکھ دھندے کے لیے مظلوم لڑکیوں کو بھی شامل کر رکھا ہے۔ جنھوں نے اپنی عصمت کے تار تار ہونے کے بعد اس کے یہاں پناہ لے رکھی ہے۔

نئی نسل کے چال ڈھال اور عادات و اطوار میں تبدیلی آ گئی ہے۔ یہاں تک کہ کپڑے وغیرہ بھی اس قدر ہیجانی پہننے لگے ہیں کہ لگتا ہی نہیں کہ کپڑا پہنے ہوئے ہے یا ننگے ہیں۔ جسم کے خدوخال پوری طرح عیاں ہوتی ہیں۔ ان نسلوں کو نہ اپنی عزت اور نہ ہی اپنے سے بڑوں کا خیال رہتا ہے۔ مشرف عالم ذوقی کا ناول 'پوکے مان کی دنیا' میں اس کا بیان ملتا ہے۔ خونی رشتوں کے درمیان اخلاقی و تہذیبی گراوٹ پیدا کر دی ہے۔ نئی نسل کے اندر اخلاقی و تہذیبی گراوٹ اس قدر آ گئی ہے کہ وہ اپنے والدین کی پرواہ بھی نہیں کرتے ہیں کہ جو وہ کر رہے ہیں اس سے والدین کو کتنی کوفت محسوس ہوتی ہوگی۔ یہ چیلینج ہی تو ہے جو قدیم نسل کو ستائے جا رہی ہے۔ جدید تکنالوجی نے جب سے دنیا کو عالمی تصور میں تبدیل کر دیا ہے اس وقت سے تہذیبوں کے تصادم کی وجہ سے اخلاقی قدروں کا زوال ہوا ہے۔

اس دور کے ناولوں میں جا بجا اس طرح کی مثالیں مل جاتی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری قدیم تہذیبی و اخلاقی قدروں کو درپیش چیلنجز ہیں۔ کیونکہ اس دور میں ہر طرف سے ان قدروں کو مٹانے کے لیے حملے ہو رہے ہیں۔ لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی اس دلدل میں پھنستے جا رہے ہیں۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری تہذیبی و اخلاقی قدریں بحرانہ دور سے گزر رہی ہیں۔

☆☆☆